AL-MISBAH RESEARCH JOURNAL

Al-Misbah, **Vol. 3, No. 2**(2023),63-78
https://almisbah.info/

"چالیس چراغ عشق کے" اور "دشتِ سوس" اشتراکات وافتراکات اجمالی جائزہ

Comparative Analytical “Forty rules of love" and "Dasht e Soos

*Muhammad Saleem Sarwar
**Dr. Irshad Begam

ABSTRACT

In this article, the English language novel "Forty Rules of Love" and the Urdu novel "Dasht-i-Soos" have been compared in the context of Sufism. "Forty Rules of Love" is a novel by Elif Shafaq. Elif Shafaq has written a novel about history, Sufism, philosophy and women and Sufism has been discussed in this novel. Dasht-e-Soos is a novel by Jameela Hashmi. Jameela Hashmi also has a special recognition in Urdu literature regarding historical novels. In this novel, she has mentioned the famous Sufi Hussain bin Mansoor Hallaj. By comparing the two novels, similarities and different aspects of Sufism have been revealed. Especially, many mysteries of the relationship between Sufi and humanity and between Sufi and God have been revealed.

Keywords: Comparative Study, Elif Shafaq, jameela Hashmi, Sufism

ایلف شفق ۲۵ اکتوبر ۱۹۷۱ء کو ستراسبرگ، فرانس میں پیدا ہوئیں۔ ایلف شفق ایک سال کی تھیں جب ان کے والدین کے درمیان علیحدگی ہوگئی اور ایلف شفق کو ان کی والدہ شفق اتیمان اپنے ساتھ لے کر ترکی آگئیں اور اس طرح ان کی پرورش ان کی والدہ نے کی۔ ایلف شفق نے سیاست کے مضمون کے ساتھ ترکی میڈل ایسٹ ٹیکنکل یونیورسٹی سے بے۔ اے کیا اور پھر بعد ازاں مطالعہ نسائیت پر ایم اے اور پی ایچ ڈی کی۔ ایلف شفق نے انگریزی اور ترکی زبانوں میں لکھا اور دونوں میں برابر مقبولیت حاصل کی۔ ایلف شفق نے جہاں اعلیٰ تعلیم حاصل کی وہیں مشاہداتی طور دنیا کی سیر بھی کی اور اس حوالے سے ان کی تحریریں اس بات کی عکاس بھی ہیں۔ ان کے تعارف اور ناول نگاری کے حوالے بلی گرے اپنے مقالے میں لکھتے ہیں:

> "ایف شفق ایک ترکی سفارت کار کی بیٹی ہیں جنھوں نے انگلش اور ترکی دونوں زبانوں میں لکھا اور خوب نام کمایا۔ وہ فرانس کے شہر ستراس برگ میں پیدا ہوئیں اور اپنا زیادہ تر وقت میڈرڈ میں گزارا اور پھر کچھ وقت کے لیے امریکہ میں بھی مقیم رہیں اور آجکل انگلینڈ کی جامعہ آکسفورڈ سے وابستہ ہیں"۔[1]

ایلف شفق بحیثیت ناول نگار دنیا بھر میں اپنی پہچان آپ ہیں۔ ان کی قابلیت اور پسندیدگی کا یہ عالم ہے کہ ان کے پہلے ہی ناول "Pinhan" پر ان کو رومی پرائز سے نوازا گیا ہے۔ پہلے ناول اور اس پر ملنے والے پرائز سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ان کا تصوف کی

---

* Phd Scholar, Department of Urdu, Federal Urdu University, Islamabad.
** Lecturer, Department of Urdu, NUML, Islamabad.

ISSN-Online: 2790-8828
ISSN-Print: 2790-881X

طرف رجحان تھا۔ترکی میں رومی پرائز ان لوگوں کو دیا جاتا ہے جن کی تحریریں تصوف کے دائرے میں آتی ہیں۔اس حوالے سے فرخ سہیل گوئندی لکھتے ہیں:

"ایلف شفق ترکی کی مقبولِ عام ادیبہ ہیں۔وہ اپنی کہانیوں میں پیش کردہ مشرق اور مغرب کے خوبصورت امتزاج کے باعث دنیا بھر میں معروف ہیں۔ناقدین کے مطابق وہ ہم عصر ترکی ادب اور عالمی ادب میں ایک جداگانہ آواز ہیں۔ان کی تحریروں کے موضوعات میں خواتین، حقوقِ نسواں ،اقلیتیں، تارکین وطن اور ان کے مسائل، متنوع ثقافتیں، ثقافتی سیاست، تاریخ، فلسفہ اور خصوصاً صوفی ازم سرِ فہرست ہیں۔"[2]

ایلف شفق انگلش اور ترکی دونوں زبانوں میں برابر لکھ رہی ہیں ان کو پوری دنیا میں مقبولیت حاصل ہے۔اس ناول میں ایلف شفق نے مولانا جلال الدین رومی اور مشہور صوفی شمس تبریز کے ذریعے محبت کے چالیس اصول بیان کیے ہیں۔اور اس ناول کی اہمیت اس وقت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب تیرھویں صدی کے مشرقی تصوف کو اکیسویں صدی کے مغربی دائرے کے ساتھ جوڑتی ہیں۔اس ناول کے تیرھویں صدی اور اکیسویں کے تصوف کے جوڑ کے حوالے سے طولبا محمد امینی اپنے ایم اے کے مقالے میں لکھتے ہیں:

"درحقیقت ان دو واقعات میں نا صرف دو صدیوں کا تعلق ہے بلکہ تاریخی اور مذہبی واقعات کے ذریعے ایک دوسرے سے مشابہت کے ذریعے جڑے ہوئے ہیں۔ شمس تبریز اور مولانا جلال الدین رومی کا رشتہ تیرھویں صدی میں تھا اور ہیں۔ شمس تبریز اور مولانا جلال الدین رومی کا رشتہ تیرھویں صدی میں تھا اور اکیسویں صدی میں ایلا اور اے عزیز ظہارا کی صورت میں دوبارہ وقوع پزیر ہوا۔ اکیسویں صدی میں ایلا رومی کے مشابہ اور اے عزیز ظہارا شمس تبریز کی روح لے کر دوبارہ دنیا میں آتے ہیں۔اس ناول میں اے عزیز ظہارا کو جدید شمس تبریز کے طور پر دکھایا گیا ہے"۔[3]

ایلف شفق نے تصوف کی دنیا کا ایک اہم واقعہ جو شمس تبریز اور مولانا روم کے نام سے مشہور ہے اس واقعے کو موجودہ دور کے ایلا اور عزیز کے ساتھ جوڑ کر اس بات کی ہمیت کو واضح کیا ہے کہ موجودہ دور میں بھی انسانیت کو محبت کی اشد ضرورت ہے۔"چالیس چراغ عشق کے" ادبی دنیا میں نہایت اہمیت کا حامل ناول ہے۔اس کی اہمیت کے حوالے سے بلی گرے لکھتے ہیں:

"محبت کے چالیس چراغ بلاشبہ ان میں سے ایک زیادہ نمایاں اور تجارتی لحاظ سے کامیاب ترین ناول ہے امیر اال زینے اسے رومی رجحان قرار دیا ہے"۔[4]

ایلف شفق نے اس ناول کے لکھنے سے پہلے تصوف کے متعلق پڑھا اور پھر اس حوالے سے ذہن میں خاکے بنائے۔ایلف شفق کا تصوف سے اور صوفیا کی سرزمین سے تعلق تو ازلی تھا اور پھر مغرب میں آنکھ کھولی تو اس طرح تو مختلف ثقافتوں کی مہک ان کے خون میں شامل ہوگئی۔تصوف پر قلم اٹھانا ہر کسی کے بس کی بات نہیں کیونکہ لکھنے والا براہِ راست مذہب کی زد میں آجاتا ہے۔ایلف شفق نے بھی سوچا ہوگا کہ کس طرح تصوف کے اصولوں کو موجودہ دور کے شدت پسند مذہبی اور سماجی لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے۔ایسا ناول جو ایک ساتھ مشرقی اور مغربی عوام کو مذہبی حدود سے بالاتر ہو اپنی لپیٹ میں لے اور تمام انسانوں کے دلوں میں گھر کر جائے۔ناول ماضی اور حال کو جوڑ دے۔یہ ناول جامعیت کے لحاظ سے اپنی نوعیت کا ایک منفرد ناول بنے۔ایلف شفق نے جس قدر سوچ بچار کے بعد یہ ناول لکھا کہیں

اس سے بڑھ کر اس نے مقام پایا۔ ایلف شفق کے ناول لکھنے سے پہلے سوچنے کے متعلق بات کو قاسم یونیورسٹی (سعودیہ) کی ڈاکٹر عفرین فیاض اپنے ایک مضمون میں نقل کرتی ہیں:

> "میں نے کہا" جیسا میں ناول لکھنا چاہتی تھی اس کے لیے ایک خاص ترتیب اور انہماک کی ضرورت تھی۔ میں نے کئی بار سوچا اور کئی سطحوں سے گزر کر اس سطح تک پہنچی اور اسی طرح یہ ناول بھی بہت سے مدارج پر محیط ہے۔ در حقیقت میں خدا اور مخلوق کی محبت اور محبت کی مختلف جہتوں کو بیان کرنا چاہتی تھی جس میں مشرق ماضی اور حال شامل ہے"۔[5]

ایلف شفق کے مذکورہ ناول کو اردو میں بھی بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ ایلف شفق نے اپنے ناولوں میں فلسفہ، تاریخ اور تصوف کو ایک ساتھ ملا کر انسانیت کی آواز بنا کر ناول کی روح بنایا ہے۔ ایلف شفق کی آواز حقیقت کے قریب نظر آتی ہے اس لیے موجودہ دور کے قارئین کا محور بنی ہوئی ہیں۔

جمیلہ ہاشمی اردو ادب کی مشہور ناول نویس اور افسانہ نگار ہیں۔ اردو ناول اور افسانے میں ان کی گراں قدر خدمات ہیں۔ جمیلہ ہاشمی کے اس قدر معروف ہونے کے باوجود بھی ان کی تاریخ پیدائش کے بارے میں دو رائے موجود ہیں۔ فضلا فارمین کرسچن کالج کے مطابق جمیلہ ہاشمی ۱۹۳۴ء میں پیدا ہوئیں مگر ان کے ایک انٹرویو سے اس تاریخ کی تردید ہوتی ہے۔ جمیلہ ہاشمی نے اپنی تاریخ پیدائش کے حوالے سے حمیرا اطہر کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے کہا:

> "میری پیدائش ۱۷ نومبر ۱۹۲۹ء گوجرہ کی ہے۔ ہم امرتسر کے رہنے والے ہیں۔ سکھوں اور ہندوؤں کے ساتھ ہمارے گھریلو مراسم تھے"۔[6]

محمد اسلم نے علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے "جمیلہ ہاشمی کا افسانوی ادب" کے عنوان سے ایک تحقیقی مقالہ لکھا اور اس تحقیقی مقالے سے بھی ۱۹۲۹ء ہی کو جمیلہ ہاشمی کی تاریخ پیدائش کی تصدیق ہوتی ہے۔ ان حقائق کو مدِ نظر رکھتے ہوئے جمیلہ ہاشمی ۱۷ نومبر ۱۹۲۹ء کو گوجرہ میں پیدا ہوئیں۔ برطانوی ہندوستان کے گوجرہ میں جمیلہ ہاشمی کی پیدائش کے وقت مسلم اور سکھ خاندان آباد تھے مگر وہاں پر سکھوں کی اکثریت تھی۔ سکھ اکثریت اور مذہبی اختلاف کے باوجود بھی مسلمانوں سے مل جل کر رہتے تھے۔

جمیلہ کی والدہ فضل النساء امرتسر کے سکول میں ہیڈ مسٹریس تھیں۔ جمیلہ کی والدہ کے عہدے کو دیکھ کر لگتا ہے کہ ان کے ننھیال میں لڑکیوں کو تعلیم دینے کا رواج عام تھا۔ جمیلہ ہاشمی کی پیدائش کے وقت ان کی والدہ اپنے میکے گوجرہ چلی گئی تھیں۔ جمیلہ ہاشمی کی ایک اور بھی بہن تھی۔ جمیلہ ہاشمی کے متعلق محمد اسلم اپنے ایم فل کے مقالے میں لکھتے ہیں:

> "والدہ فضل النساء گورنمنٹ ہائی سکول امرتسر میں ہیڈ مسٹریس تھیں؛ پہلے بچے کی پیدائش کے لیے میکے گھر میں (گوجرہ) گئی ہوئی تھیں: بچی پیدا ہوئی تو اس کا نام جمیلہ رکھا گیا۔ یہ وہی جمیلہ ہیں جو بعد ازاں جمیلہ ہاشمی کے نام سے معروف ہیں۔ جمیلہ کی والدہ گوجرہ کی تھیں، ان کی ایک اور بہن تھی، جمیلہ کے نانا، نانی اور خالہ نے قادیانی مذہب اختیار کر لیا تھا لیکن فضل النساء اپنے اصل مذہب پر قائم رہیں۔ وہ صوم وصلوۃ کی پابند اور راسخ العقیدہ مسلمان تھیں"۔[7]

جمیلہ ہاشمی کی پیدائش ننھیال میں ہوئی اور کچھ عرصہ ننھیال میں ہی گزرا۔ آنکھ کھولتے ہی جمیلہ ہاشمی کو مذہبی کشمکش کا سامنا کرنا پڑا جب ایک ہی گھر میں مختلف مذہب سے تعلق رکھنے والے لوگ موجود تھے۔ جمیلہ ہاشمی کو اپنے لیے

مذہب کا انتخاب کرنا اور نانی اور ماں میں سے کسی ایک کے نقشِ قدم پر چلنا تھا۔ مختلف المذاہب معاشرے میں رہتے ہوئے بھی اپنی ماں کی تربیت کے مطابق اسلام کو ہی اپنے لیے چنا۔

جمیلہ نے امر تسر کے سکول سے میٹرک کیا، امر تسر کے کالج سٹینڈ فورڈ سے ایف اے کا امتحان پاس کیا اور پھر اسی کالج سے ڈبل میتھ کے ساتھ بی اے کا امتحان پاس کیا۔ بی اے کے تعلیمی دور میں جمیلہ ہاشمی شاعری بھی کرتی تھیں مگر بعد میں وہ نثر کی طرف آئیں۔ جمیلہ ہاشمی کو انگریزی ادب سے خاصی دلچسپی تھی اور پھر انھوں نے ایف سی کالج سے ۱۹۵۳ء میں انگریزی ادب میں ایم کیا۔ محمد اسلم لکھتے ہیں:

> "بی اے میں ڈبل میتھ پڑھتی رہیں؛ اس وقت شاعری بھی کرتی تھیں۔ ۱۹۵۳ء کو ایف سی کالج سے انگریزی ادبیات میں ایم اے کیا۔"[8]

جمیلہ ہاشمی سکول دور میں شاعری کرتی تھیں اور شاعری ابھی کتابی صورت یا کسی رسالے تک نہیں پہنچی تھی بلکہ ہمجولیوں تک ہی محدود تھی۔ جمیلہ ہاشمی کا شاعری کا دائرہ بڑھنے کی بجائے کالج پہنچنے تک کافی محدود ہو چکا تھا۔

جمیلہ ہاشمی کی ادبی زندگی کا آغاز

جمیلہ ہاشمی نے اپنے ادبی شوق کی پرورش کے لیے لاہور کو مسکن بنایا اور ۱۹۵۷ء میں ان کا پہلا افسانہ ادبی جریدے لیل ونہار میں چھپا۔ ذوالقرنین عسکری ان کی پہلی تحریر کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "میرا پہلا افسانہ لیل ونہار میں ۱۹۵۷ء میں چھپا تھا۔ بقول سائرہ ہاشمی ان کا پہلا افسانہ "لال آندھی" تھا۔"[9]

جمیلہ ہاشمی کے ادبی سفر میں کافی وسعت اور رنگارنگی پائی جاتی ہے۔ انھوں نے تاریخ، تہذیب، مسلم معاشرت، سکھ معاشرت اور تانیثیت جیسے موضوعات کو اپنے ادبی کارناموں میں جگہ دی۔ جمیلہ ہاشمی نے اپنے ادبی دور کے آغاز میں ہی عورت کے لیے آواز اٹھائی اور جہاں عورت کے مقام کو اجاگر کرنے کی بات آئی تو انھوں نے ۱۹۶۱ء "تلاشِ بہاراں" جیسا آدم جی ایوارڈ یافتہ ناول لکھ کر شہرت دوام حاصل کی۔

جمیلہ ہاشمی ادبی تحریروں کے ساتھ ساتھ کئی ادبی حلقوں کی رکن بھی رہیں، جن میں حلقہ ارباب ذوق، مری لٹریری سرکل اور سہ ماہی جریدے وغیرہ شامل ہیں۔ جمیلہ ہاشمی کسی بھی محفل میں جاتیں تو محفل کو چار چاند لگا دیتیں۔ جمیلہ ہاشمی کی شخصیت ایسی تھی وہ جس مجلس میں شرکت کرتیں تو پوری مجلس کا دھیان ان کی طرف ہو جاتا۔ جمیلہ ہاشمی کی شخصیت کے حوالے سے محمد خالد کہتے ہیں:

> "وہ ان کمیاب لوگوں میں تھیں جو کمرے میں داخل ہوتے تو گویا ایک اور شمع جل جاتی ہے۔ اپنی ذات میں ایک انجمن، ڈلنیس، اکتاہٹ اور بیزاریاں ان کے آتے ہی اپنی راہ پکڑ لیتی تھی۔ ان کی گفتگو میں ایک ایسی رونق اور ہنگامہ خیزی کی کیفیت ہوتی تھی جو میں نے بہت کم لوگوں میں دیکھی ہے۔"[10]

جمیلہ ہاشمی شگفتہ ادبی تحریریں لکھنا پسند کرتی تھیں اور ان کی تحریریں رنگین ہوتی تھیں مطلب ان کی تحریروں میں بہترین لفاظی، خوبصورت جملے، تشبیہات اور استعارات کا استعمال باخوبی ملتا ہے۔ انھوں نے انگریزی کی سند کو ہمیشہ ناز کی نگاہ سے دیکھا کیونکہ اس کے ذریعے انھوں نے بہت سا انگریزی ادب پڑھ رکھا تھا۔ اس سے بھی ان کی تحریروں میں نکھار آیا تھا۔

تقابلی مطالعہ سے مراد ہے دو چیزوں کو آمنے سامنے لا کر ان کے خصائص کو پرکھنا اور ان میں موجود اشتراکات و افتراقات کو بیان کرنا۔ تقابلی مطالعے کے لیے انگریزی زبان میں (Comparative Studies) کے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔

لفظ "تقابل" کے انگریزی لغات سے معنی و مفہوم دیکھتے ہیں۔ انگریزی لغت "کولنز کوبلڈ" میں معنی کچھ یوں ملتے ہیں۔

"Comparative: you use comparative to show that you are judging something against a previous or different situation which is calmer than before or calmer than the situation in other places".[11]

اردو لغت میں لفظ "تقابل" کے معنی۔۔۔۔

تقابل: مقابلہ، موازنہ۔ صف: تقابلی موازنے سے متعلق، موازنے کی غرض سے م: تقابلی مطالعہ[12]

تقابلی مطالعے کی اصطلاح کے معنی کوئی سی دو چیزیں جو قریب قریب ایک ہی گروہ (صنف) سے تعلق رکھتی ہوں ان کا تجزیہ کرنا۔ جب کوئی سی دو چیزوں کو آمنے سامنے لائیں گے تو ان کے اشتراکات اور افتراکات بھی سامنے آئیں گے۔ برطانیہ میں موجود وارک یونیورسٹی کی پروفیسر سوزن بیسنٹ یوں تعریف کرتی ہیں:

"تقابلی ادب مختلف ثقافتوں کے متوں کا مطالعہ ہے۔ ایک کثیر العلمی مضمون جس کا زمان اور مکان کے بعد میں

پیدا ہونے والے ادب کے درمیان رشتوں کے نقوش سے متعلق ہے۔"[13]

"چالیس چراغ عشق کے" اور "دشتِ سوس" کا مختصر تعارف

"چالیس چراغ عشق کے" ایلف شفق کا مشہور ترین ناول ہے جس کی بنیادی زبان انگریزی ہے اور ایک سال بعد اسے "Ask" کے نام سے ترکی زبان میں بھی ترجمہ کیا گیا اور ترکی زبان میں بھی اسے برابر مقبولیت حاصل ہوئی۔ اردو زبان میں ہما انور نے "چالیس چراغ عشق کے" کے نام سے ترجمہ کر کے حسن عسکری ایوارڈ حاصل کیا۔ اردو زبان میں بھی اس ناول کو بے پناہ مقبولیت ملی۔ اس تحقیقی مضمون میں "چالیس چراغ عشق کے" اور "دشتِ سوس" میں موجود اشتراکات و افتراکات کا اجمالی جائزہ پیش کیا جا رہا ہے۔ "چالیس چراغ عشق کے" میں موجود اہم کردار مولانا روم، شمس تبریز، ایلا، اے عزیز ظہارا دکھائے گئے ہیں۔ ان کرداروں کی مدد سے انسانی محبت اور خوشی کے حصول اور خدا کے قرب کے حصول کے ذرائع دکھائے گئے ہیں۔ اس ناول کے ذریعے مذہب، ثقافت اور علاقیت سے بالاتر محبت دکھائی گئی ہے۔ اس ناول میں تصوف کے حوالے سے ایک بڑی بات یہ بھی سامنے آئی کہ بظاہر جس انسان کو دنیا اور دین والے برا سمجھتے ہیں صوفی اس کے اندر کے انسان کو پہچان لیتا ہے اور اس کی باطنی اچھائی کو سامنے رکھتے ہوئے اس سے محبت کرتا ہے اور اس کی تعظیم کرتا ہے۔

ایلف شفق نے مغرب میں آنکھ کھولی اور جس خطے کو باہر سے جتنا روشن پایا وہ اس قدر ہی اندر سے تاریک اور کھوکھلا نکلا۔ ایلف شفق ایک سال کی تھیں کہ ان کے والدین کے درمیان علیحدگی ہو گئی اور اس بات نے ان پر گہرا اثر اڈالا۔ اس علیحدگی کے بعد ان کی والدہ ان کو اپنے ساتھ لے کر ترکی آ گئیں اور پھر ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت مشرقی آب و ہوا میں ہوئی۔ ایلف شفق بچپن میں ہی والد کی محبت سے محروم ہو گئی اور پھر اس خلا کو پر کرنے کے لیے کتابوں کا مطالعہ کرتی رہیں۔ ایلف شفق کو تاریخ سے گہرا لگاؤ تھا اور انھوں تصوف اور تاریخی کتب کا خوب مطالعہ کیا اور وہ محبت کا خلا جو ان کے ارد گرد تھا انھی کتابوں نے پر کیا اور جس کے اثرات ان کی آج تک کی تحریروں میں نظر آ رہے ہیں۔

ایلف شفق اپنی تحریروں سے یہ ثابت کرنا چاہتی ہیں کہ دنیا کے تقسیم در تقسیم کے دائروں سے نکل کر محبت اور خالص محبت کو عام کیا جائے۔ ایلف شفق نے جس بات کی کمی کو شدت سے محسوس کیا وہ محبت کی ناپیدگی تھی۔ اس ناپیدگی نے انسان کو اندر سے کھوکھلا اور

باہر سے نیم مردہ اور وحشی بنا کر رکھ دیا تھا۔ دین اور دنیا کا علم محبت کے بغیر مکمل ہوتا تو شمس تبریز مولانا روم کے لیے دعا نہ کرتے اور صرف دعا ہی نہیں بلکہ انھوں نے مولانا رومی کو محبت کے اصول سمجھائے اور پھر انسانیت سے بلا تقسیم محبت کا درس دیا۔ ایلف شفق نے اس بات کو محسوس کیا جیسے زمانہ ماضی اور حال، مشرق اور مغرب اور دین اور دنیا میں تقسیم ہو چکا ہے۔ اس تقسیم کو اگر ایک دائرے میں بند کیا جا سکتا ہے تو وہ تصوف ہے۔ ایلف شفق نے اس تصوف کے لیے ذریعے صرف مذہب یا خدا کی ذات میں مدغم ہو کر خود کی نفی کرنے کو ہی بیان نہیں کیا بلکہ خدا کی پیدا کردہ انسانیت سے بے پناہ محبت کو بھی عام کر دیا ہے۔

ایلف شفق اگر مشرق یا مسلم دنیا کے تصوف کو بیان کرنا چاہتیں تو ایک صوفی کی اپنے خدا سے محبت کو واضح کر دیتیں یا پھر وہ ایک صوفی کا اپنے نفس کو ملامت کر کے اپنی "میں" کو ختم کرنے کو واضح کر دیتیں مگر ان کے نزدیک پوری دنیا اہم تھی اور اس وقت پوری دنیا کو ایسی محبت کی ضرورت ہے جو پر خلوص ہو اور بلا تقسیم ہو۔

جمیلہ ہاشمی اردو ناول نگاری میں ایک اہم نام ہیں۔ جمیلہ ہاشمی نے اردو ناول نگاری کے ساتھ ساتھ افسانہ نگاری میں بھی جوہر دکھائے۔ جمیلہ ہاشمی اپنے ناول "تلاشِ بہاراں" پر آدم جی ایوارڈ حاصل کر چکی ہیں۔ جمیلہ ہاشمی کا ناول "دشت سوس" تصوف کا اہم باب اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ اسے ایک تاریخی ناول بھی سمجھنا چاہیے کیونکہ اس ناول میں حسین بن منصور حلاج کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ اس ناول میں جن بزرگ ہستیوں اور تاریخی ادوار کا ذکر کیا گیا ہے وہ زیادہ تر حقیقت پر مبنی ہیں۔ ناول اگرچہ حقیقی زندگی کی کوئی تصویر پیش کر رہا ہوتا ہے مگر اس کو تخیل کا زیور ضرور پہنایا جاتا ہے اور یہ کام جمیلہ ہاشمی نے بھی کیا ہے۔

جمیلہ ہاشمی نے انگریز کے ہندوستان میں آنکھ کھولی جہاں اس وقت کچھ علاقوں میں تو نفرت کا بازار گرم تھا مگر کچھ علاقوں میں آپسی محبت ایک مثال تھی۔ جمیلہ ہاشمی نے امرتسر کے جس علاقے میں آنکھ کھولی وہاں سکھوں اور مسلمانوں کے آپس میں اچھے تعلقات تھے اور گھریلو سطح پر ایک دوسرے لین دین اور خوشی و غم کے رسم و رواج میں سانجھ تھی۔

جمیلہ ہاشمی ایک ایسی ادیبہ تھیں جنھوں نے مختلف خطوں کی ثقافت اور تاریخ کو حد درجے کی لگن سے اپنی تحریروں میں جگہ دی ہے۔ جمیلہ ہاشمی نے دشتِ سوس کے علاوہ بھی تاریخی ناول لکھے ہیں۔

"دشتِ سوس" جمیلہ ہاشمی کا ایک کرداری ناول ہے جس میں اس نے انا الحق کا نعرہ لگانے والے حسین بن منصور حلاج کا قصہ بیان کیا ہے۔ ناول میں کچھ تخیلاتی باتیں بھی نظر آتی ہیں جیسے اغول اور حسین کے قصے کو ایک عشقیہ داستان کے روپ میں حد سے زیادہ بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا ہے۔ اس ناول میں حسین کی موت انا الحق کے نعرے سے بڑھ کر حامد بن عباس کی رقابت کے تحت نظر آتی ہے۔ اس ناول میں بیان کردہ تصوف کے عناصر کا جائزہ لیا گیا اور ان عناصر میں ابتدائی عنصر جو سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ حسین بچپن سے ہی خدا کی ذات کے بارے میں اور مقدر کے بارے میں جاننے کا خواہاں نظر آتا ہے اور ان حقائق کو پانے کے لیے سہل عبداللہ تستری کے مدرسے میں اپنے استاد کی غیر موجودگی میں ان کے کچھ خفیہ رسائل کا مطالعہ کرتا ہے۔ ان رسائل کے مطالعے سے بھی حسین کی لگن اور جذبہ نظر آتا ہے کہ وہ حقائق کو جاننے کے لیے کس قدر بیتاب نظر آتا ہے۔ اس ناول میں حسین اور تصوف کے حوالے سے جو دوسری اہم بات نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ حسین خدا کی زمین کو گھوم پھر کر دیکھنے کا دلدادہ نظر آتا ہے۔ حسین بن منصور صرف علم اور دنیا کی سیر کا ہی خواہش مند نظر نہیں آتا بلکہ وہ انسانوں کے ساتھ بلا تفریق محبت اور ہمدردی کا بھی داعی نظر آتا ہے۔

دشتِ سوس میں حسین اور اغول کا عشق بھی سامنے آتا ہے مگر یہ عشق جسمانی حدود سے بالاتر اور روحانی جذبات میں حد سے گزرا ہوا نظر آتا ہے۔ اغول اور حسین ایک دوسرے کی پہچان رکھتے ہیں اور ایک دوسرے کی روحانی پاکیزگی اور مقاصد کی بلندیوں کا

اعتراف کرتے ہیں۔ حسین بن منصور حلاج کی عبادت و ریاضت کا مقصد صرف اور صرف خود کو خدا کی ذات میں مدغم کرنا تھا اور آخر ایک وقت آتا ہے جب حسین بن منصور حلاج اس مقام پر پہنچ جاتا ہے۔ حسین بن منصور حلاج کا یہی دعویٰ ہی حسین کی موت کا باعث بنتا ہے۔

دونوں ناولوں میں جو اہم باتیں سامنے آتی ہیں ان میں انسانیت سے بلا تفریق محبت اور ہمدردی ہے۔ انسان اس وقت تک انسانیت کے مرتبے پر فائز نہیں ہو سکتا جب تک اس کے اندر انسانیت سے محبت نہ ہو۔ حسین بن منصور حلاج، اغول، شمشتبریز، رومی، ایلا اور اے عزیز ظہارا کے ذریعے اس محبت کو علاقائی، لسانی، مذہبی اور جنسی تقسیم سے بالاتر دکھایا گیا ہے۔ مجوزہ ناولوں کے تقابل سے یہ بات سامنے آتی ہے محبت ایک ایسا جذبہ ہے جس کے لیے انسان جان تک کی قیمتی چیز کی پرواہ نہیں کرتا۔ اگر ایک انسان کو اپنے خدا سے محبت ہو جائے تو وہ اس ذات میں مدغم ہونے کے لیے پہلے اپنے نفس کی قربانی اور پھر اپنی جان تک کی قربانی دے کر اپنے محبوب میں مدغم ہو جاتا ہے۔ اور اگر یہی محبت ایک انسان کو خدا کے لیے ایک انسان سے ہو جائے تو بھی اپنی جان تک قربان کر کے شمس تبریز کی صورت میں حیات جاوید پالیتا ہے اور انسانیت کے لیے محبت کی مثال قائم کر دیتا ہے۔ تصوف سے یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ محبت کبھی مرتی نہیں وہ ہر دور میں زندہ رہتی ہے۔ اگر ایک صوفی کسی دور میں انسانیت سے محبت کی اعلیٰ مثال قائم کر کے دارِ فانی سے چلا جاتا ہے تو بعد میں وہ محبت کسی اور انسان کی صورت میں نمودار ہوتی ہے۔ جیسے محبت ایک لافانی جذبہ ہے اسی طرح صوفیا بھی ایک سلسلے کی کڑیاں ہوتے ہیں یعنی ایک صوفی گیا تو اس کی روح کسی اور صوفی کی صورت میں زمین پر نمودار ہو جاتی ہے۔ یہی مثال ایلف شفق نے مولانا روم کو ایلا کی صورت میں اور شمس تبریز کو اے عزیز ظہارا کی صورت میں پیش کر کے دی ہے۔

"چالیس چراغ عشق کے" اور "دشتِ سوس" میں موجود اشتراکات

تصوف اور حقیقت کے راز۔

"چالیس چراغ عشق کے" اور "دشتِ سوس" میں تصوف کو مختلف کرداروں کی مدد سے پیش کیا گیا ہے۔ ان ناولوں میں دو ایسے کردار دیش کیے گئے ہیں جو علم حقیقت کے رازوں کی تلاش میں سرگرداں ہوتے ہیں اور علم کے ابتدائی مراحل سے ہی دوسروں سے کچھ زیادہ متجسس نظر آتے ہیں اور ایسے رازوں کے متلاشی بن جاتے ہیں جن تک رسائی ہر کسی کی نہیں ہو سکتی۔ رومی دینی اور دنیاوی علم کے ماہر تھے اور اپنے علاقے میں ایک نام رکھتے تھے مگر حقیقت کی دنیا کے راز پانے میں تب ہی دلچسپی پیدا ہوئی جب شمس تبریز سے ملاقات ہوئی۔ اور پھر یہ دلچسپی اس قدر بڑھ گئی کہ خدا تعالیٰ سے دعا کرنے لگے کہ میرا سینہ کھول دے تاکہ میں وہ راز جان سکوں جن کا میں متلاشی ہوں۔ رومی کی دعا کے حوالے سے "چالیس چراغ عشق کے" میں ایلف شفق لکھتی ہیں:

> "بطن اللہ۔۔۔ خدا کا مخفی چہرہ۔ میرے قلب کو کھول دیجیے تاکہ میں حق دیکھ سکوں۔۔۔ ہمارے سامنے راہِ حق کے سات مراحل کھلے تھے۔۔۔ سات مقامات جن پر سے ہر نفس کو معرفتِ حق اور یکتائی کے حصول کے لیے گزرنا پڑتا ہے۔"[14]

یہ راہِ حق کے مراحل جن کو طلب کرنا آسان تھا اور ان مراحل سے گزر کر خدا کے قرب کو پہنچنا بڑا مشکل کام ہے۔ اس مرحلے تک رسائی کے لیے اپنے نفس کو کٹھن سے کٹھن مرحلے سے گزارنا پڑتا ہے۔

"دشت سوس" میں حسین بن منصور حلاج کا بھی یہی حال ہے کہ وہ اپنی ذات کو خدا کی ذات میں مدغم کرنے اور حقیقت کے راز پانے کے لیے بیتاب نظر آتا ہے۔ حسین بھی عبادت و ریاضت میں مگن رہتا ہے اور خدا کی ذات کو راضی کر کے حقیقت کے سراغ لگانے

کے لیے پل پل تڑپتا ہے۔ حسین چاہتا کہ اس کا سینہ بھی اس قدر فراخ ہو جائے کہ وہ ان رازوں تک رسائی حاصل کر لے جن تک عام آنکھ اور دنیادار انسان نہیں پہنچ سکتا۔

"حسین نے جنگل میں اپنی عبادت گاہ میں ایک کونے میں سجدہ ریز ہو کر کہا: میرے پروردگار! میں اکیلا ہوں اے میرے مالک میں اکیلا ہوں۔ مجھے وہ عطا ہو جس سے وحشتِ تنہائی دور ہو۔ مجھے اپنی محبت کی آتشِ سوزاں میں پگھلنے کا حوصلہ تو دے۔ ہاں میرے خالق، مجھے انعام دے کہ میں اکیلا ہوں۔"[15]

حقیقت کے راز پانے کے لیے مولانا روم اور حسین بن منصور حلاج اپنی عبادات میں ہمیشہ محو و مگن نظر آتے ہیں۔ جہاں دنیا کے کسی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے محنت کرنی پڑتی ہے وہیں حقیقت کے راز پانے کے لیے انسان کو اپنی ذات کو خدا کی ذات میں مدغم کرنے کے لیے حد سے زیادہ عبادت و ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے مطلب تزکیہ نفس کی ضرورت ہوتی ہے۔

حسین اپنی عبادات میں اس قدر محو و مگن رہتا کہ کھانا پینا اور سونا تک بھول جاتا۔ حسین بن منصور حلاج کی عبادات کے حوالے سے بابا ذہین شاہ تاجی لکھتے ہیں:

"منصور جہاں علم و فضل میں یکتائے روزگار تھے، وہاں زہد و ریاضت اور عبادت و طاعت میں بھی اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے۔ کتاب و سنت کی پیروری اپنے آپ پر لازم جانتے تھے، کم از کم ایک ہزار رکعت، روزانہ نماز ادا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ یہ ایک ہزار رکعت میں اپنے آپ پر فرض سمجھتا ہوں۔"[16]

حقیقت کے رازوں کو پانے کے لیے مولانا روم ہر وقت خدا کی عبادات میں لگے رہتے تھے۔ مولانا روم کو شمس تبریز خدا کی محبت کے حصول کے حوالے سے نصیحت کرتے ہیں کہ یہ انسان کی اپنی لگن اور شوق پر منحصر ہے۔

"آپ جانتے ہیں کہ خدا کی محبت ایک بحرِ بے کنار ہے اور انسان جتنا پانی اس سے لے سکتے ہیں، لینے کی جدوجہد کرتے ہیں۔ لیکن انجام کار ہم سے ہر کوئی جتنا پانی لے سکتا ہے، وہ ہمارے پیالے پر منحصر ہے۔ کچھ لوگوں کے پاس بڑا برتن ہوتا ہے جب کہ کچھ کے پاس ڈول جب کہ کچھ ایسے ہیں جن کے پاس صرف پیالے ہوتے ہیں۔"۔[17]

تصوف اور انسانیت سے محبت:

محبت خدا سے خدا کی مخلوق کے ذریعے کرنا صوفیا کو زیادہ پسند ہے اور اس محبت پر کامل یقین رکھتے ہیں۔ ایک صوفی خدا کی محبت خدا کی مخلوق سے بغیر کسی تفریق کے چاہتا ہے۔ صوفی کے نزدیک خدا کی ساری مخلوق قابلِ محبت اور قابلِ رحم ہے۔ اگر نوعِ انسان میں سے کوئی انسان بھٹک بھی گیا ہو تو یہ ضروری نہیں کہ وہ مکمل طور پر ہی بھٹک گیا ہو مطلب اس کا ظاہر اور باطن ایک جیسا ہو گیا ہو۔ صوفیا کی محبت مذہبی، لسانی، علاقائی اور گروہی تقسیم سے بالاتر ہو کر تمام انسانوں سے ایک جیسی ہوتی ہے۔ شمس تبریز نے مولانا روم کو ایک طوائف، شرابی اور بھکاری سے محبت کر کے اس بات کا درس دیا کہ یہ لوگ دنیا کی نظر میں برے ہو سکتے ہیں مگر ان کے باطن میں اپنے خالق کی محبت شاید دوسروں سے بہتر ہو۔ صوفی بغیر کسی سبب اور انجام کے محبت کرتا ہے کیونکہ اس کے نزدیک لمحہ موجود ہی سب کچھ ہوتا ہے۔ ایک صوفی کی محبت کے حوالے سے ایلف شفق "چالیس چراغ عشق کے" میں لکھتی ہیں:

"محبت ہی سبب ہے۔ محبت ہی منزل ہے۔ اور جب آپ خدا سے اس قدر محبت کرتے ہیں، جب آپ اُس کی ہر تخلیق سے اُسی کی وجہ سے اور اس کی بدولت محبت کرتے ہیں تو بیرونی عناصر ہوا میں تحلیل

ہو جاتے ہیں۔ اس مقام سے آگے مزید کوئی "میں" نہیں ہو سکتی۔ آپ صرف صفر ہو کر رہ جاتے ہیں،
اتنا بڑا صفر کہ جو آپ کے پورے وجود کو ڈھاپ لیتا ہے۔"[18]

حسین بن منصور حلاج بھی محبت کے بارے میں ایسے ہی تاثرات رکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک محبت ہر مادی اور غیر مادی شے میں موجود ہوتی ہے اور یہی محبت ہے جس کے باعث کائنات کی ہر شے کی اہمیت ہے اور کائنات کا یہ نظام چل رہا ہے۔ خدا نے اپنی مخلوق سے محبت کی اور مخلوق کو بھی محبت سکھائی اور مخلوق میں سے جو لوگ نفس کے مراحل طے کرنے کے بعد صوفیا کے درجے تک پہنچ جاتے ہیں ان کے نزدیک دنیادار بننے کی مشقت مضحکہ خیز ہے۔ حسین بن منصور حلاج نے انسانیت سے محبت کو کائنات کا جزو لازم قرار دیا ہے۔ حسین بن منصور حلاج بھی شمس تبریز اور مولانا روم کی طرح بغیر کسی تفریق کے محبت کے حق میں ہیں۔ حتیٰ کے اغول ایک غیر مسلم اور پھر حسین کا دادا اور دادا کے بہت سے دوست اسلام سے دور تھے مگر انہوں نے سب کے ساتھ محبت بغیر کسی تفریق کے جاری رکھی۔ حسین بن منصور حلاج کا محبت کے بارے میں جو یقین تھا اس حوالے سے جمیلہ ہاشمی "دشتِ سوس" میں بیان کرتی ہیں:

"محبت کا کبھی نہ ختم ہونے والا نغمہ جو عرش فرش اور ارد گرد ایستادہ لوگوں کے دلوں پر مادی اور غیر مادی شے میں جاری و ساری تھا۔ محبت جو فاتح عالم ہے اور دنیا جو بس ایک قدم ہے۔ ایکجست، دنیادار بننے کی مشقت کتنی مضحکہ خیز ہے۔"[19]

شمس تبریز کے محبت کے نظریے کے حوالے سے ایلف شفق لکھتی ہیں:

"تمہارا کیا خیال ہے، خدا مکہ میں رہتا ہے یا مدینہ میں؟ یا پھر کہیں کسی مقامی مسجد میں؟ لوگ کس طرح یہ تصور کر سکتے ہیں کہ خدا کسی محدود جگہ میں مقیم ہو سکتا ہے جب کہ وہ خود کھل کر فرماتا ہے، میں آسمانوں میں اور زمین میں نہیں سماپاتا مگر اپنے بندے کے دل میں سما جاتا ہوں۔"[20]

تصوف اور عشق:

عشق کو بظاہر دو جسموں کے درمیان حد سے بڑی محبت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے مگر صوفیا کے نزدیک عشق ایک زینہ ہے جس کے ذریعے وہ خود کو اور دوسرے انسانوں کو اصل منزل کا نشان دکھاتے ہیں۔ صوفیا کا عشق جسمانی حدود اور مطالب سے ماورا ہوتا ہے وہ کسی مادی فائدے کے لیے یہ عشق نہیں کرتے بلکہ ان کے عشق کا تصور اور مقصد صرف اور صرف انسان اور خدا کی محبت کو مضبوط کرنا ہوتا ہے۔ ایک صوفی اس عشق کے ذریعے یہ بات بھی ثابت کرتا ہے کہ عشق کے بغیر زندگی کس قدر بے کیف اور بے رنگ ہوتی ہے۔ یہ عشق ہی جو زندگی کو حقیقی لطف سے آشنا اور سات رنگوں کا پیکر بناتا ہے۔ ایک صوفی سمجھتا ہے جس طرح میں اپنے خالق سے عشق کرتا ہوں اسی طرح یہ دیگر لوگ بھی عشق کی گہرائی اور تڑپ سے آگاہ ہو جائیں۔ "چالیس چراغ عشق کے" اور "دشتِ سوس" میں عشقیہ واقعات سامنے آئے ہیں جیسا کہ ایلا کا اے عزیز ظہارا سے عشق اور حسین بن منصور حلاج کا اغول کا ساتھ عشق۔ یہ دونوں صوفی جب عشق کرتے ہیں تو ان کے محبوب کی روحوں میں بھی تڑپ نمایاں ہوتی ہے۔ صوفیا کا عشق مجازی کے عشق کے برعکس روحانی عشق ہوتا ہے کیونکہ یہ جسم سے اگلے درجے پر مطلب روح سے عشق کرتے ہیں۔

ایلا اور اے عزیز ظہارا کے عشق کی بات ہو، رومی اور شمس تبریز کے عشق کی بات ہو یا پھر حسین بن منصور حلاج اور اغول کے عشق کی بات ہو۔ یہاں پر ہمیں مادی عشق کے برعکس محبوب بھی اپنے عاشق کی طرف اسی شدت سے بڑھتے ہوئے نظر آتے ہیں جس

شدت سے عاشق اپنے محبوب کی تڑپ رکھتا ہے۔ ایلا اے عزیز ظہارا کا ناول پڑھ کر اس پر فدا ہو جاتی ہے اور دوسری طرف اے عزیز ظہارا بھی ایلا کی میل پڑھ کر اس سے ملنے کا متمنی ہو جاتا ہے۔ اے عزیز ظہارا بہت دور ایلا سے ملنے بوسٹن چلا آتا ہے۔

"عزیز نے کہا، جب لوگ غیر معمولی اور غیر متوقع حالات کے لیے تیار ہو جائیں تو بے لگام خوابوں سے بھی آگے عجیب واقعات رونما ہوتے ہیں لیکن ایلا اس سب کے لیے ذرہ برابر تیار نہ تھی جو ہوا: اے عزیز ظہارا اس سے ملنے بوسٹن چلا آیا۔"[21]

حسین اور اغول کا عشق بھی بظاہر ایک مادی عشق نظر آتا ہے مگر حسین اغول کے جسم سے بے پرواہ اور اغول حسین کے لمس سے لاتعلق نظر آتی ہے مگر یہی عشق، عشقِ حقیقی کی لو دیتا ہے۔ اغول نے حسین کو اور حسین نے اغول کو پہچان لیا تھا۔ ان دونوں کی روحیں عشقِ حقیقی سے منور نظر آتی ہیں۔ حسین کے عشق کے حوالے سے جمیلہ ہاشمی لکھتی ہیں:

"آتش پرستی اس کے خون میں رچی بسی تھی اور یہ آگ وہ نہیں تھی جس کو ہم دیکھتے تھے بلکہ یہ وہ آگ تھی جس کے اندر آتش و آب و خاک و باد اور یہ حرارت، حرارتِ عشق تھی اور اس کی حرکت سے لو نکلتی تھی اور وہ عشقِ حقیقی کی لو تھی۔"[22]

یہ وہ عشق ہے کچھ لوگ اِسے وراثت سے جوڑتے اور کچھ لوگ اس کو مادی عشق کا نام دیتے ہیں مگر ایک صوفی کا عشق مادی نہیں بلکہ روحانی ہوتا ہے جس عشق کا اصل تعلق اللہ تعالیٰ کی ذات سے ہوتا ہے۔

تصوف اور روحانی طاقت:

"چالیس چراغ عشق کے" اور د"شتِ سوس" کے صوفیا کو کچھ ایسی روحانی کرامات عنایت ہوئی ہیں جنہیں دیکھنے والے ساحرانہ باتیں کہتے ہیں مگر یہ سب ان کی عبادت و ریاضت کے سبب قربِ ربانی کے طفیل ہوا ہے۔ شمس تبریز اور حسین بن منصور حلاج عوام کے بارے میں ان کے دل کی کچھ ایسی باتیں بتاتے ہیں جن پر وہ لوگ حیران ہوتے ہیں ان صوفیا کو جادوگر قرار دیتے ہیں۔ شمس تبریز جب بابا زمان سے بند کمرے میں باتیں کرتے ہیں تو شمس تبریز کا مرید ان کی باتیں خفیہ طریقے سے سننے کی کوشش کرتا ہے اور شمس تبریز بند کمرے میں سے اسے دیکھ لیے ہیں۔

حامد بن عباس کا غلام عمار، جب حسین کو حامد بن عباس کے سامنے لے کر جاتا ہے تو وہ بھی حسین پر یہی الزام عائد کرتے ہیں کہ یہ ساحری ہے اور بہت سے راز جانتا ہے۔ حامد بن عباس نے جب حسین بن منصور حلاج کو تاریک خانے بند کرنے کے لیے اپنے حبشی غلام کو دے کر بھیجا تو حبشی غلام نے حسین کو کندھے سے پکڑا تو اُسے اپنے کندھے میں اتنا درد ہوا کہ یوں لگا جیسے اس کے کندھے کی ہڈی اور ماس الگ الگ ہو گئے ہیں۔ اسی درد زدہ کندھے پر جب حسین نے ہاتھ رکھا تو اس کا کندھا بالکل ٹھیک ہو گیا اور یوں لگا جیسے اس میں کبھی درد تھا ہی نہیں۔ حبشی غلام نے دیکھا کہ تاریک خانہ روشن ہو چکا ہے اور اس بندی خانے کی دیواریں نظر کی حد تک وسیع ہو چکیہیں۔ یہ سب کرامات دیکھ کر حبشی غلام حیران ہو کر حسین کے قدموں میں گر پڑا۔ حسین بن منصور پر ایسے ہی الزام بھی لگائے گئے کہ یہ غائب جانتا ہے، دلوں کی باتوں کو بیان کر دیتا ہے۔ حسین بن منصور کی روحانی طاقتوں کے حوالے حامد بن عباس نے جو باتیں کی تھیں ان باتوں کو جمیلہ ہاشمی بیان کرتی ہیں:

"آدمی کیا شے ہے کہ خدائی کا دعویٰ کرے، غیب دان ہو، مہدی موعود ہو موسموں پر تصرف رکھتا ہو۔ دلوں کے حال جان لیتا ہو، تقدیریں بدل دینے پر قادر ہو۔ اس کی پرستش کی جاتی ہو۔"[23]

دونوں ناولوں کے مرکزی کرداروں کا قتل:

تصوف اپنی ذات کو تج دینے کا نام ہے مطلب ہر کام اللہ کی رضا کے لیے کیا جائے۔ جب ایک صوفی اپنے ہر اعمال کی بنیاد اللہ کی رضا پر رکھتا ہے تو وہ اپنے اعمال کے دنیاوی نتائج کو بھول جاتا ہے۔ لوگ اس کے بارے میں کیا سوچیں گے اور اس کے ان اعمال پر کس طرح کا رویہ اختیار کریں گے۔ صوفیا کو اپنے اعمال کی وجہ سے بعض اوقات دنیا دار جان سے بھی محروم کر دیتے ہیں۔ دنیاداروں یا شریعت پسندوں کے نزدیک صوفیا کے اعمال اور دعوے کفریہ ہوتے ہیں اور ان کی عبادات بدعت کو چھوتی ہیں۔

"چالیس چراغ عشق کے" میں شمس تبریز کے اعمال کی وجہ سے بھی بہت سے دین دار اور دنیادار ان سے نفرت کرنے لگے تھے اور ان کے اعمال کو کفر سمجھنے لگے تھے اور آخر کار اس عناد کا بدلہ شمس تبریز کے قتل کی صورت میں لیا۔

> "ہم نے اس کی لاش اٹھائی جو عجیب طور پر بے حد ہلکی پھلکی تھی اور اُسے کنویں میں گرا دیا۔ ہانپتے ہوئے ہم میں سے ہر ایک نے ایک قدم پیچھے ہٹایا اور لاش کے پانی میں گرنے کے چھپاکے کے انتظار کرنے لگے۔ وہ آواز کبھی نہ آئی۔"[24]

حسین بن منصور حلاج کو اللہ نے اپنی رضا اور قرب کا صلہ بااثر دعاؤں کی صورت میں دیا تھا اور وہ جب بھی کسی دکھی یا بیمار کے لیے دعا کرتے اسے شفا مل جاتی یا اگر وہ کسی کے حال کے بارے میں کوئی بات کہتے تو وہ پوری ہو جاتی۔ انھی باتوں کو لے کر لوگ ان کے مخالف ہونا شروع ہو گئے تھے۔ اس اختلاف کی آگ نے اُس وقت شدت پکڑی جب حسین بن منصور حلاج نے انا الحق کا نعرہ لگایا۔ آخر حسین بن منصور نے بھی شمس تبریز کی طرح جان دے کر ہی خدا تعالیٰ کی محبت میں مدغم ہونے کی قیمت ادا کی۔

> "سر جھٹک کر، کوئی راہِ فرار نہ پا کر ابو عمر نے اس کاغذ پر اپنی مہر ثبت کر دیا اور فتویٰ لکھ دیا۔ اور پھر لوگوں نے قضاۃ نے اور شحنہ نے اور خود ابو الحسین آشنائی نے اپنی اپنی مہریں لگائیں اور نام لکھے اور حسین ابن منصور کی موت کے پروانے پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔"[25]

مجوزہ ناولوں میں جو چند بڑے بڑے اشتراکات تھے ان کا بالا سطور میں ذکر کر دیا گیا ہے۔ تصوف کے حوالے سے جن مرکزی پہلوؤں کا ذکر کیا گیا ان میں حقیقی علم کے حصول سے لے کر تمام مذاہب سے بالاتر ہو کر انسانیت سے محبت، پوری دنیا کو ایک ہی دائرہ سمجھنا، عشق حقیقی کے راز پانے اور راہِ خداوندی میں جان دینے تک کے امور میں مجوزہ ناولوں میں مماثلت کا اظہار پایا جاتا ہے۔ اور کچھ پہلوؤں اور باتوں میں تصوف کے حوالے سے مجوزہ ناولوں افترا کی پہلو بھی سامنے آئے ہیں ان کا ذیل میں ذکر کیا جائے گا۔

افتراکات

تصوف اور فرضی عبادات

صوفیا اپنی زندگی کو اللہ کے لیے وقف کرنے کے بعد ایسی کوئی خواہش نہیں رکھتے جن سے وہ اپنے مقصد سے دور ہو جائیں۔ صوفیا صرف اور صرف اللہ کی رضا چاہتے ہیں اور اس کے لیے کبھی اپنی جان کو اذیت دے کر مطلب بھوک پیاس برداشت کرتے ہوئے اپنے نفس کی تربیت کرکے اللہ کی رضا چاہتے ہیں اور کبھی صوفیا کرام شب بھر جاگ کر نفلی عبادات کرتے ہیں تاکہ اللہ کی رضا حاصل ہو جائے۔ "چالیس چراغ عشق کے" اور "دشتِ سوس" میں تصوف کا جائزہ لیتے ہوئے جزوی طور پر یہ اختلاف سامنے آیا ہے کہ

شمس تبریز فرضی عبادات جس میں حج روزہ اور نماز کے اہتمام کو شماریات کہتے ہیں اور کہتے ہیں خدا کوئی پنساری نہیں جو ان کی نیکیوں کو تولتا ہے بلکہ وہ انسان سے محبت کو شمار کرتا ہے۔ شمس تبریز اپنے نفس کی تربیت کرتے ہیں اور خود کو انسانیت کی خدمت کے لیے وقف کر کے اللہ کی رضا چاہتے ہیں۔ شمس تبریز کا یہ نظریہ ہے کہ خدا مکہ مدینہ یا کسی مسجد میں نہیں بلکہ خدا اپنی مخلوق کے دلوں میں بستا ہے اگر اُس کی مخلوق سے محبت کی جائے تو وہ خود ہی خوش ہو جائے گا۔ اس طرح سے اللہ کی رضا حاصل کی جا سکتی ہے۔

> "بے خبر و مدہوش مسلمان! اگر کوئی رمضان میں خدا کے نام پر روزے رکھتا ہے اور ہر عید پر اپنے گناہوں کی تلافی میں بھیڑ یا بکری کی قربانی دیتا ہے، اگر کوئی عمر بھر مکہ کا حج کرنے کی جدوجہد میں رہتا ہے اور دن میں پانچ بار نماز پر رکوع و سجود کرتا ہے مگر اس کے دل میں محبت کی کوئی گنجائش نہیں تو اس کی ساری محنت و مشقت کا کیا فائدہ؟۔۔۔ تمہارا کیا خیال ہے، خدا مکہ میں رہتا ہے یا مدینہ میں؟ یا پھر کہیں کسی مقامی مسجد میں؟ لوگ کس طرح یہ تصور کر سکتے ہیں کہ خدا کسی محدود جگہ میں مقیم ہو سکتا ہے جب کہ وہ خود کھل کر فرماتا ہے، میں آسمانوں میں اور زمین میں نہیں سماپاتا مگر اپنے بندے کے دل میں سما جاتا ہوں۔"[26]

حسین چاہتا تھا کہ وہ بھی اللہ اور اس کے محبوب کے در پر حاضری دے اور اپنی مراد پائے اسے اس بات کا بھی یقین تھا کہ یہ وہی جگہ ہے جہاں ابراہیمؑ نے دعا مانگی تو ان کی دعا پوری ہوئی اور پھر یہیں سے اللہ نے اپنے محبوب کو دیدار کے لیے بلایا تھا۔ حسین حج کے لیے اس امید کے ساتھ جاتا ہے کہ وہیں اس کی بھی مراد پوری ہو گی۔ حسین مکہ پہنچ کر بیت اللہ کے پاس ہی قیام کرتا ہے کہ اسے بلاوا آئے گا تو وہ تو اس گھر میں حاضری دے گا اور پھر حسین اس حاضری کے لیے دعا بھی کرتا ہے۔

> "حسین نے نہایت عاجزی سے جبینِ نیاز زمین پر رکھی۔ بارِ الٰہی! میں بھی تیرا مشتاق ہوں اور اس لیے میں تیرے دوست کی دید کا مشتاق ہوں۔ مجھے بلاوا ہے تو باریابی کی اجازت دے۔ وہ مسجد الحلیفہ میں تھا جہاں رسولِ پاک نے احرام باندھا تھا۔ مسجدِ قبا اور مقامِ شہدا میر حمزہ تک مدینہ منورہ کا حرم تھا۔ سفید میناروں اور مسجدوں کے گنبد دکھائی دے رہے تھے۔۔۔ وفورِ شوق سے اس کے آنسو تھم نہیں رہے تھے۔"[27]

تصوف کے حوالے سے یہ اختلاف سامنے آیا ہے کہ ایک صوفی کے نزدیک اللہ تعالیٰ مسجدوں میں نہیں بلکہ اللہ انسانوں کے دل میں ہوتا ہے اور دوسرے صوفی کے نزدیک فرضی عبادات ضروری ہیں اور انھی کے ذریعے انسان اللہ کی خوشنودی حاصل کر سکتا ہے۔

تصوف اور خدا کی ذات:

تصوف میں جب صوفی اپنی ذات کی نفی کرتا ہے تو اس کا مقصد خدا تعالیٰ کی خوشنودی ہی ہوتا ہے۔ وہ چاہتا ہے میرے اس کام سے خدا تعالیٰ راضی ہو جائے اور مجھے اس کا قرب مل جائے۔ شمس تبریز خدا کی محبت تو چاہتے ہیں مگر خود کو خدا کی مخلوق سمجھتے ہیں مطلب خود کو خدا کی ذات میں مدغم نہیں کرنا چاہتے اور وہ اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ خدا خدا ہے اور بندہ بندہ ہے اس لیے وہ خدا کی ذات میں مدغم نہیں ہو سکتا۔

تصوف میں جب اپنی ذات کی نفی کی جاتی ہے تو اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ اب صوفی کی اپنی کوئی ذات نہیں رہی اور اس کی ذات اپنے مالکِ حقیقی کی ذات میں مدغم ہو چکی ہے۔ ایسا ہی نظریہ "دشتِ سوس" میں حسین بن منصور حلاج کے حوالے سے سامنے آتا ہے وہ اپنی ذات کی یہاں تک نفی کرنا چاہتے ہیں کہ اپنی ذات کو تحلیل کر دینا چاہتے ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ ان کی اپنی کوئی پہچان نہ رہے۔ حسین بن منصور حلاج کی ذات کے حوالے سے جمیلہ ہاشمی "دشتِ سوس" میں لکھتی ہیں:

> "جب حسین کے کان میں اس کی آواز پڑ جاتی تو وہ سر تا پا کانپ جاتا۔ وہ محبوب بننا نہیں چاہتا تھا۔ وہ تو اس کی محبت بھی نہیں چاہتا تھا۔ اسے تو خود اس میں فنا ہونے مٹ جانے کا شوق تھا۔ اسے تو صرف اس کا شوق تھا۔ اسے اپنی ہستی سے اپنے ہونے سے کوئی محبت نہ تھی۔"[28]

حسین بن منصور تمام عبادات اس لیے کرتے ہیں کہ اللہ ان پر راضی ہو جائے اور ان کی ذات کو اپنی ذات میں مدغم کر لے۔ حسین بن منصور بچپن سے ہی یہ تڑپ اپنے اندر لیے ہوئے تھے کہ ان کی اپنی کوئی ذات نہیں اور اصل ذات تو وہی ہے اور اس کو اپنی ذات کی ضرورت بھی نہیں۔

تصوف اور ابلیس کا تصور:

صوفیا کے نزدیک انسان کے بھٹکنے کی وجہ اس کا اپنا نفس تسلیم کیا جاتا ہے۔ اگر انسان اپنے نفس کی تربیت کر لے تو وہ اچھائی کے راستے پر رواں دواں رہ سکتا ہے۔ انسان کی تربیت اور اس کو ورغلانے میں نفس کا سب سے اہم کردار ہے۔ اگر نفس کی تربیت کرتے ہوئے مقام راضیہ تک پہنچایا جائے تو یہی نفس انسانیت کے لیے اصلاح کا باعث بن جاتا ہے۔ اس سلسلے میں مجوزہ ناولوں میں یہ جزوی اختلاف بھی سامنے آیا ہے کہ "چالیس چراغ عشق کے" میں شمس تبریز انسانی نفس کی تربیت پر زور دیتے ہیں اور وہ شیطان کے ورغلانے یا بھٹکانے کو اہمیت نہیں دیتے۔ شیطان کے حوالے سے شمس کہتے ہیں:

> "اس لیے شیطان کو بھی اپنے باہر تلاش نہ کرو۔ شیطان باہر سے حملہ آور ہونے والی کوئی غیر معمولی طاقت نہیں ہے۔ وہ تمہارے اندر ہی موجود معمولی آواز ہے۔ اگر تم خود کو پوری طرح جان لو، اپنے تاریک اور روشن رُخ دونوں کا ایمان داری اور شدت سے سامنا کر لو تو تم شعور کی اعلیٰ ترین صورت کو پہنچ جاؤ گے۔"[29]

دشتِ سوس میں حسین بن منصور حلاج شیطان کے حوالے سے شرعی یقین رکھتے ہیں اور وہ اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ شیطان کو حضرت آدمؑ کو سجدہ نہ کرنے کی پاداش میں دنیا میں وارد کیا گیا اور پھر انسان کا دشمن بن گیا۔ شیطان اپنی ہر ممکن کوشش کرتا ہے کہ وہ انسان کو ورغلائے اور اس کو بدی کے راستے پر گامزن کرے۔ شیطان کے حوالے سے حسین امام رازی کو بتاتے ہیں:

> "حسین پھر ہنسا۔" آقا۔ آپ سمجھتے ہیں کلام پاک میں جو لکھا ہے وہ اس بات کے سوا نہیں جو میں نے کہی ہے۔ خدا نے آدم کو بھی بنایا اور ابلیس کو بھی بنایا۔ "" ٹھیک "" آدم کی پیشانی میں اپنا نور رکھا۔ "" رکھا "" فرشتوں کو حکم دیا کہ اسے سجدہ کرو۔ سب نے کیا مگر ابلیس نے نہیں کیا۔ وہ راندہ درگاہ ہوا۔ عرش سے نکالا گیا۔ خوار ہوا۔ انسانوں کو گمراہی میں مبتلا کرنے کرنے کے لیے وہ بھی دنیا میں وارد ہوا۔"[30]

حسین بن منصور حلاج یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر شیطان نہ ہوتا تو دنیا میں اتنی رونق نہ ہوتی اور پھر سب لوگ ایک ہی راستے پر ہوتے تو کسی بھی انسان کا امتحان نہ ہوتا۔ شیطان کے ذریعے اللہ اپنے بندوں کو آزماتا ہے۔

تصوف اور سزا و جزا کا تصور:

دنیا دار العمل ہے اور آخرت جزا و سزا کا گھر ہے۔ اسلام کو ماننے والا ایک عام انسان یہ مانتا ہے دنیا کے اعمال کی جزا و سزا انسان کو دوسرے جہان میں ضرور ملے گی مطلب اگر ایک انسان دنیا میں اچھے اعمال کرے گا تو اس کو آخرت میں جنت کی صورت میں انعام ملے گا۔ مجوزہ ناولوں میں تصوف کا جائزہ لیتے ہوئے یہ جزوی اختلاف سامنے آیا ہے کہ "چالیس چراغ عشق کے" میں شمس تبریز کے حوالے سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ وہ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ جنت، جہنم کا کوئی تصور نہیں بلکہ انسان کے اعمال اس کی محبت اور نفرت سے پیوستہ ہیں۔ ایک انسان محبت کرتا ہے تو یہی دنیا اس کے لیے جنت ہے اگر وہ نفرت کرتا ہے تو یہی دنیا اس کے لیے دوزخ ہے۔ اس ناول کے تجزیے سے یہ بات سامنے آئی کہ شمس تبریز کا تصور انسان سے محبت ہے اور یہی محبت اس کی راحت اور اس کے خالق کی رضا ہے۔

> "دوزخ ابھی اور یہیں موجود ہے۔ اسی طرح جنت بھی یہیں موجود ہے۔ دوزخ کے بارے میں پریشان ہونا یا جنت کے خواب دیکھنا چھوڑ دو کیوں کہ وہ خود ہر لمحے کے اندر موجود ہیں۔ ہر مرتبہ جب ہم محبت میں گرفتار ہوتے ہیں، ہم جنت میں پہنچ جاتے ہیں۔ ہر مرتبہ جب ہم نفرت و حسد کرتے ہیں یا کسی سے لڑتے ہیں، ہم لڑکھڑا کر جہنم کی آگ میں جا گرتے ہیں۔"[31]

شمس تبریز اس دنیا میں محبت اور نفرت کو جنت جہنم کا نام دیتے ہیں وہیں "دشتِ سوس" میں حسین بن منصور حلاج جنت اور جہنم کا یقین رکھتے ہیں۔ حسین کہتا ہے کہ اگر جنت، جہنم کا تصور نہ ہوتا تو دنیا میں کوئی بھی انسان اس کے حصول کے لیے کاوش نہ کرتا۔ حسین شیطان کی بات کرتے ہوئے جنت کی اہمیت بھی واضح کرتے ہیں:

> "انسانوں کو گمراہی میں مبتلا کرنے کے لیے وہ بھی دنیا میں وارد ہوا۔ اگر وہ نہ ہوتا تو کوئی گمراہی میں مبتلا کیونکر ہوتا۔ اور یہ سوز و سازِ حیات ہی نہ ہو وہ نہ ہو تو جنت نہ ہو۔ اس کی تڑپ نہ ہو۔ اس کے حصول کے لیے کدو کاوش نہ ہو۔"[32]

نتائج:

۱۔ "چالیس چراغ عشق کے" میں انسانیت سے محبت کو بنیاد بنایا گیا ہے اور "دشتِ سوس" میں انسان اور خدا کی محبت کا رشتہ گہرا ہے۔
"چالیس چراغ عشق کے" میں ماضی اور حال کا فرق ختم کرنے کے لیے محبت کو مربوط کڑیوں کی صورت میں پیش کیا ہے اور "دشت سوس" میں وقت کی قید کا فرق دکھانے کے لیے بندے کو خدا کی شناسائی کے لیے مختلف گھاٹیوں کا مسافر دکھایا گیا ہے۔

۲۔ عشق روحِ انسانی سے واقف ہونے اور خدا تک رسائی کا مختصر ترین راستہ ہے۔ "چالیس چراغ عشق کے" میں صوفیا انسانیت سے عشق میں خدا کے متلاشی نظر آتے ہیں کے اور "دشت سوس" میں فرد خاص خود میں خدا کا متلاشی نظر آتا ہے۔

۳۔ عورت کا کردار مخالف جنس کو روح کی انسیت سے واقف کروانے کی صفات پر مبنی کردار ہے۔ "چالیس چراغ عشق کے" میں موجود کمیا کا شمس سے عشق اور ایلا کا اے عزیز ظہارا سے عشق اور دشتِ "سوس" میں حسین اور اغول کا عشق یہ سب مجازی عشق جسمانی ضرورت سے پاک حقیقی عشق کے عکاس ہیں۔

۴۔ "چالیس چراغ عشق کے" میں مولانا روم اور شمس تبریز کے ذریعے زمانہ ماضی اور حال کے انسان کے درمیان فرق کو ختم کرنے کے لیے محبت کو بنیاد بنا کر پوری انسانیت کی تاریخ پیش کی گئی ہے اور "دشت سوس" میں حسین بن منصور حلاج کے ذریعے ایک خدا کے طالب صوفی کی تاریخ پیش کی گئی ہے۔

حوالہ جات:

۱۔ Billy Gray,Rumi,Sufi spirituality and teacher disciple relationship in Eli Shafak,s The Forty Rules of love,p125 https//doi.org/10.30674/scripta.84280

۲۔ فرخ سہیل گوئندی، (مقدمہ) چالیس چراغ عشق کے (لاہور: جمہوری پبلیکشنز، ۲۰۱۷) بیرونی صفحہ

۳۔ Tolba Mohamed Amine,The impact of Sufism on the contemporary American Society in ElafShafaks novel, The Forty rules of love,Larabi Bin M,hidiUniversity,Oum El bouagh,2016,p54.55

۴۔ Billy Gray,Rumi,Sufi spirituality and teacher disciple relationship in Eli Shafak,s The Forty Rules of love,p127,https//doi.org/10.30674/scripta.84280

۵۔ Dr.AfreenFaiyaz,Thou Shalt Love!:The Contemporary Relevance of Rumi in ElifShafak,SThe Forty Rules of love A character based…QasimUniversity,Saudi Arabia,2019,p22

۶۔ حمیرا اطہر، جمیلہ ہاشمی سے ملاقات، اخبار خواتین (کراچی: (ہفت روزہ)، ۷ تا ۱۳ اکتوبر ۱۹۸۷ء)، ص ۲۰

۷۔ محمد اسلم، جمیلہ ہاشمی کا افسانوی ادب (مقالہ برائے ایم فل) (اسلام آباد: علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، ۱۹۹۶ء) ص ۲۴۷

۸۔ ایضاً ص ۲۴۸

۹۔ سید ذوالقرنین عسکری، جمیلہ ہاشمی بحیثیت ناول، مقالہ برائے ایم فل (بہاولپور: اسلامیہ یونیورسٹی، ۱۹۸۸ء) ج ۱، ص ۳۰

۱۰۔ محمد خالد اختر، آتشِ رفتہ، ماہِ نو، (لاہور: اکتوبر ۱۹۸۸ء)، ج ۱، ص ۱۸

۱۱۔ Collins Cobuild,AdvancedLearner,s English Dictionary,Harper Collins Publishers Great Britain,2006,p-277

۱۲۔ شان الحق حقی، فرہنگِ تلفظ (اسلام آباد: ادارہ فروغ قومی زبان، ۲۰۱۷ء) ج ۱، ص ۲۲۹

۱۳۔ سوزن بیسنٹ، ترجمہ توحید احمد، تقابلی ادب: ایک تنقیدی جائزہ (اسلام آباد: پور باکادمی، ۲۰۱۵ء) ج۔ ۱، ص ۵

۱۴۔ ایلف شفق، ہما انور (مترجم) چالیس چراغ عشق کے (لاہور: جمہوری پبلیکشنز، ۲۰۱۷ء) طبع اول، ج ۱، ص ۱۸۰

۱۵۔ جمیلہ ہاشمی، دشتِ سوس (لاہور: سنگِ میل پبلیکیشنز، ۲۰۱ء) طبع دوم، ج ۱، ص ۲۶۳

۱۶۔ بابا ذہین شاہ تاجی، کتاب الطواسین لا منصور الحلاج، ایجوکیشنل پریس، کراچی، ۱۹۹۵، ص ۸

۱۷۔ ایلف شفق، ہما انور (مترجم) چالیس چراغ عشق کے (لاہور: جمہوری پبلیکشنز، ۲۰۱۷ء) طبع اول، ج ۱، ص ۱۷۰

۱۸۔ ایضاً ص ۱۹۸

۱۹۔ جمیلہ ہاشمی، دشتِ سوس (لاہور: سنگِ میل پبلیکیشنز، ۲۰۱ء) طبع دوم، ج ۱، ص ۱۰۰

۲۰۔ ایلف شفق، ہما انور (مترجم) چالیس چراغ عشق کے (لاہور: جمہوری پبلیکشنز، ۲۰۱۷ء) طبع اول، ج ۱، ص ۱۹۶

۲۱۔ ایضاً ص ۲۹۹

۲۲۔ جمیلہ ہاشمی، دشتِ سوس (لاہور: سنگِ میل پبلیکیشنز، ۲۰۱ء) طبع دوم، ج ۱، ص ۱۵۰

۲۳۔ ایضاً ص ۴۵۶

۲۴۔ ایلف شفق، ہما انور (مترجم) چالیس چراغ عشق کے (لاہور: جمہوری پبلیکشنز، ۲۰۱۷ء) طبع اول، ج ۱، ص ۳۵۶

۲۵۔ جمیلہ ہاشمی، دشتِ سوس (لاہور: سنگِ میل پبلیکیشنز، ۲۰۱ء) طبع دوم، ج ۱، ص ۴۷۲

۲۶۔ ایلف شفق، ہما انور (مترجم) چالیس چراغ عشق کے، جمہوری پبلیکشنز، لاہور، ۲۰۱۷، ص ۱۹۶

۲۷۔ جمیلہ ہاشمی، دشتِ سوس (لاہور: سنگِ میل پبلیکیشنز، ۲۰۱ء) طبع دوم، ج ۱، ص ۱۹۶۔۱۹۷

۲۸۔ ایضاً ص ۱۹۳

۲۹۔ ایلف شفق، ہما انور (مترجم) چالیس چراغ عشق کے (لاہور: جمہوری پبلیکیشنز، ۲۰۱۷ء) طبع اول، ج ا، ص ۱۲۴

۳۰۔ جمیلہ ہاشمی، دشتِ سوس (لاہور: سنگِ میل پبلیکیشنز، ۲۰۱ء) طبع دوم، ج ا، ص ۲۰۳

۳۱۔ ایلف شفق، ہما انور (مترجم) چالیس چراغ عشق کے (لاہور: جمہوری پبلیکیشنز، ۲۰۱۷ء) طبع اول، ج ا، ص ۱۹۸

۳۲۔ جمیلہ ہاشمی، دشتِ سوس (لاہور: سنگِ میل پبلیکیشنز، ۲۰۱ء) طبع دوم، ج ا، ص ۲۰۳